ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی

یارِ من ہمیں

Abstract: - *The paper discusses symbolic expressions in universal themes and concepts in the poetry of Mirza Muhammad Siyar, an 18th century poet of Khowar, in Chitral NWFP. Surrounded by snow clad peaks of the Hindukus and Hinduraj mountain ranges in proximity to the borders of Afghanistan Tajikistan, Pamir, Sinkiang and Kashmir.*

Mirza Muhammad Siyar is known as a mystic poet whose love song "Yar-e-Man Hamee" presents a model of classical notes with a lot of symbols. Selected lines from the folk poetry of Chitral give a vivid picture of mystic traditions in the mountainous regions of northern Pakistan in the 18th century and the thoughts expressed in the song interestingly resemble the lines of thought followed by great Sufi poets of south and central Asia such as Shah Latif, Rahman Baba Sachal Sarmast, Bulle Shah, Sultan Bahu, Amir Khusrow and Farirduddin Attar.

The paper, thus introduces a hidden knowledge of classical sufi tradition from the folk poetry of Khowar, a Dardic language in the Indo-Aryan family.

''یارِ من ہمیں'' شمالی پاکستان کے پہاڑی ضلع چترال میں انیسویں صدی کے صوفی شاعر مرزا محمد سیئر کا کھوار کلام ہے۔ جو شاہ عبداللطیف بھٹائی کے شاہ جو رسالو یا محمد بخش کے ہیر رانجھا، اور کلام رحمان بابا کی طرح عوام میں یکساں مقبول ہے اور گذشتہ دو صدیوں سے سینہ بسینہ محفوظ چلا آرہا ہے کم وبیش چھ نسلوں نے اسے گایا اور ہر نسل نے آنے والی نسل کو منتقل کیا۔ اس کلام میں جو عالمگیر صداقتیں ہیں۔ وقت گذرنے کے ساتھ ان کی ہمہ گیری اور حقیقت بیانی میں سرمو فرق نہیں آیا۔ چترال کا ضلع صوبہ سرحد کے شمال میں افغانستان کے صوبہ جات بدخشان گلزا اور نورستان سے ملا ہوا علاقہ ہے شمال میں اس کی سرحدیں واخان کی 15 کلومیٹر تنگ پٹی کے راستے تاجکستان پامیر اور چینی صوبہ سنکیانگ سے ملتی ہیں۔ زمانہ قدیم میں چترال کے راستے شاہراہ ریشم کا جنوبی حصہ کاشغر، یارکند چین، سمرقند اور بخارا کو کابل اور پشاور سے ملاتا تھا۔ تجارتی قافلے اور حاجیوں کے کاروان چترال کے راستے کو محفوظ تر راستہ خیال کرتے تھے۔ اطراف کے لوگ چترال کو ''کاشغر خورد'' کہتے تھے جو پشتو زبان میں آکر ''قاشقر'' بنا اور آج تک چترال کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چترال کی

ریاستی تاریخ ایک ہزار سالوں پر محیط ہے۔ دسویں صدی عیسوی سے چودھویں صدی عیسوی تک کالاش، سولک اور یورخون نامی قبائل نے چترال پر حکومت کی 1320 عیسوی میں رئیس خاندان نے پہلی بار چترال پر مسلمانوں کی حکومت قائم کی۔ 1595ء میں کٹور خاندان نے حکومت حاصل کی۔ 1969ء میں ریاست کے انضمام کے ساتھ ریاست کا خاتمہ ہوا۔ اس تاریخی پس منظر میں چترال کے لوگ حصول علم کے لیے بخارا، سمرقند، کاشغر، ختن اور یارکند کا رخ کرتے تھے۔ بیسویں صدی میں جنوب کی طرف دہلی اور بمبئی تک جانے لگے۔ دیوبند، آگرہ اور سہارن پور کے مدارس سے لوگوں نے علم حاصل کیا۔

چترال میں ملا ہوا پہلا قلمی نسخہ کلیات محمد شکور غریب ہے۔ غریب ریاستی حکومت میں اتالیق تھا ان کا زمانہ 1705 سے 1782 تک ہے۔ ان کی کلیات میں فارسی کے ساتھ ساتھ کھوار کلام کا حصہ بھی ہے۔ اصناف نظم کے لحاظ سے کلیات غریب قصائد، غزلیات، مثنوی اور قطعات پر مشتمل ہے مثنوی غریب کا سفرنامہ ہے چترال افغانستان اور ایران کے راستے عراق تک جانے کے بعد بوجوہ انہیں واپس آنا پڑا تھا۔ دوسرا قلمی نسخہ مرزا محمد سیئر کے کلام کا مجموعہ ہے یہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ غزلیات کا ہے۔ دوسرا حصہ مثنوی کے طرز پر جنگ نامہ ہے جو تاریخ چترال کے اہم ادوار کا مفصل بیان ہے اور عرف عام میں ''شاہنامہ'' کہلاتا ہے۔ ''یارِ من ہمیں'' مرزا محمد سیئر کے کھوار کلام کا نمونہ ہے۔ اور مقامی زبان میں فارسی کے دری تلفظ کی نسبت سے ''یورمن ہمیں'' کہلاتا ہے۔ مرزا محمد سیئر نے اتالیق محمد شکور غریب کا زمانہ پایا مگر عمر میں ان سے چھوٹے تھے۔ آپ کی پیدائش کا سال 1766ء بتایا جاتا ہے۔ جبکہ سال وفات 1838ء ہے آپ نے گھر کے ستون پر 1227 ھجری کی تاریخ اپنے ہاتھ سے کندہ کیا۔ دیوان غزلیات میں بھی ایک جگہ 1227ء کی تاریخ رقم ہے جو عیسوی حساب سے 1812 بنتی ہے۔(۱)

تاریخی اعتبار سے آپ شاہ عبدالعزیز متوفی 1823 اور اخوند عبدالغفور سیدو بابا متوفی 1878 کے ہم عصر تھے۔ مرزا محمد سیئر کے فارسی اور کھوار کلام پر تھوڑا بہت کام ہوا ہے۔ اسکی روشنی میں دیکھا جائے تو مرزا محمد سیئر ایک عظیم صوفی شاعر کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ پروفیسر فتح محمد ملک نے مرزا محمد سیئر کو صوفی شاعری کی وسط ایشیائی اور ہندوستانی روایات کا حسین امتزاج قرار دیا ہے۔(۲)

چترال میں مرزا محمد سیئر کو مختصراً ''مہسیار'' کہا جاتا ہے۔ اُن کے لیے بابا کا لفظ پہلی بار غلام عمر نے استعمال کیا۔ وجہ یہ تھی کہ انھوں نے مرزا محمد سیئر پر جو کام کیا اُسکو چھپوانا چاہتے تھے لوک ورثہ کا قومی ادارہ کسی ''بابا'' کا کلام ہی چھاپنے پر آمادہ تھا۔ اس لیے غلام عمر نے اپنے ممدوح کو ''مرزا'' سے ''بابا'' بنا دیا۔ جسے ہم Donoir Driven نام کہہ سکتے ہیں گویا پبلشر کی شرط کو پورا کرنے کے لیے عرف عام کو نئے نام میں بدل دیا گیا۔ غلام عمر کی کتاب باباسیئر 1984 میں شائع ہوئی، کتاب میں منتخب فارسی غزلیات کے ساتھ کھوار کلام ''یارِمن ہمیں'' کا ایک حصہ دیا گیا ہے، تعارفی مضمون میں غلام عمر نے مرزا محمد سیئر کے زمانے کا تفصیلی ذکر کیا ہے، سن پیدائش اور سن وفات پر حتمی رائے نہیں دی۔ البتہ ان کے سفر وسط ایشیا اور سفر ہند کا ذکر کیا ہے اور مرزا محمد سیئر کے ایک مصرعے سے استدلال کیا ہے کہ جس میں وہ کہتا ہے کہ:

عزم سر ہندنا صر علی دارم (۳)

سیر کے فارسی کلام میں استغنا اور سلوک کی رفعتیں خیال کی بلندی اور فن کی پختگی کے ساتھ ملتی ہیں ایک غزل کا مقطع ہے۔

در تشنگی ہزار کہ بمیرم سیر
لب تر زمنت آب گہر نمی کنم

ترجمہ: میں پیاس سے مرنے کو اس بات پر ترجیح دونگا کہ ''آب گہر'' کی منت کر کے اپنی پیاس بجھاوں۔

راہ سلوک میں اپنی فریفتگی اور آشفتہ سری کی تاریخ اکثر شاعروں نے آنکھ کھولنے یا ہوش سنبھالنے سے شروع کی ہے۔ مگر سیر کہتا ہے کہ میں نے پیدائش کے ساتھ اپنے ہونٹ وا کئے تو میری ماں نے گُھٹی میں دودھ کی جگہ تیرے عشق کا شراب ارغواں مجھے پلایا۔ یہ بھی ایک غزل کا مقطع ہے۔

مستانہ ام سیر جو کشا دم لب از عدم
مادر بجائے شیر بکامم شراب ریخت

''یارمن ہمیں کھوار میں ہے جو ہند آریائی زبانوں کی دردی شاخ سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ گیت کلاسیک کا درجہ رکھتا ہے۔ اسکی دُھن بہت سریلی ہے۔ ٹیپ کے بند میں ''یارِمن ہمیں'' آتا ہے جبکہ ہر شعر کے آخیر میں ''یارے'' کی تکرار ہوتی ہے۔ جس کا مطلب ہے ''اے مرے یار'' یارمن ہمیں'' کے اشعار کی تعداد 200 سے زیادہ ہے۔ کلام، سوات، غذر، گلگت اور چترال میں کھوار بولنے والوں کی پانچ لاکھ آبادی میں ہر پیر و جواں اور مرد و زن کو یارمن ہمیں کے دو چار بول ضرور یاد ہوتے ہیں اور اس کی دُھن پر سب سر دُھنتے ہیں ''یارِمن ہمیں'' کے اشعار میں مضامین کا تنوع پایا جاتا ہے تاہم یہ رومانیت سے مملو اور سلوک سے معمور ہے۔ محاکات، تشبیہات اور استعارے سب مقامی ہیں مگر ان کے مفاہیم اور معانی آفاقی نوعیت کے ہیں اس گیت کی تخلیق کا زمانہ انیسویں صدی کا ربع آخر اور اٹھارویں صدی کا ربع اول ہے۔ تاہم اس گیت کے مضامین زمانے کی قید سے آزاد ہیں۔ اور اکیسویں صدی کے ربع اول سے بھی اتنی ہی نسبت و تعلق یا مطابقت رکھتے ہیں جتنی اپنی تخلیق کے زمانے سے مطابقت رکھتے تھے مثلاً مولانا روم نے مثنوی کی ابتدا اس لازوال شعر سے کی۔

بشنواز نے چوں حکایت می کند وز جد ایہا شکایت می کند

ترجمہ: بانسری کی آواز پر کان دھرو۔ بانسری کیسی کہانی سناتی ہے۔ یہ دراصل جدائی کا گلہ ہے۔ جُزو، اپنے کل سے ملنا چاہتا ہے۔

(سالک اپنی منزل کو پانا چاہتا ہے) ''یارمن ہمیں'' کے ایک شعر میں مرزا محمد سیئر نے یہی مضمون دریا اور کشتی کے استعاروں کی مدد سے بیان کیا ہے۔

ویزے نین غم ژیو مان چھوچے نین وقت مہ ہسی
تہ قسمتو کھشتی نیزے مہ دریا ہو نسی یارے

ترجمہ: ''اے محبوب! تیری جدائی میں یہ حال ہے کہ شام کو غم اور صبح دم رنج میری خوراک ہے۔ میرے محبوب! تم میری قسمت کی کشتی ہو مجھے منجدھار سے ساحل پر لے جاؤ۔ تا کہ میں اپنی مراد کو پا کر بامراد ہو

جاؤں۔'' محی الدین ابن عربی کے مکتب فکر میں وحدت الوجود اور ہمہ اوست کا تصور پایا جاتا ہے۔ اس تصور کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ سالک کو ہر چیز میں محبوب کا جلوہ نظر آتا ہے عربی، فارسی اور اردو میں یہ مضمون ہزار رنگ میں آیا ہے، کھوار میں مرزا محمد سیئر نے ''یارِ من ہمیں'' کے اندر یہ مضمون بالکل نئے پیرایے میں باندھا ہے۔

ریشنو بوم رنگ گنی شیر مہ خوشو یا قوت شوناری
مہ چھیک بشار گنیتائے شرانہ فقیر کواری

ترجمہ: ''اے لوگو! محبوب تجاہل عارفانہ سے کام لے رہا ہے اور مجھے دروازے پر دیکھ کر پوچھتا ہے کہ یہ درویش کہاں سے آیا! میں جہاں نظر دوڑاتا ہوں محبوب کا جلوہ ہی دیکھتا ہوں مجھے تو ریشن (گاؤں) کی سرخ مٹی میں بھی محبوب کے یاقوتی ہونٹوں کا رنگ نظر آتا ہے۔'' رقیب پر محبوب کی عنایات و کرم نوازیوں کا مضمون بہت گھسا پٹا اور پا افتادہ مضمون ہے۔ علامہ اقبال نے محبوب حقیقی سے مخاطب ہو کر یہ مضمون نئے اسلوب میں باندھا۔ ان کی نظم ''شکوہ'' کا شعر ہے:

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

مرزا محمد سیئر نے یارِ من ہمیں کے ایک شعر میں یہی مفہوم ایک اچھوتے پیرایے میں ادا کیا ہے ان کا شعر ہے۔

اوا کی تہ لاڑی یمان تو مہ پیچھاؤ خوری لاڑیس یارے
لغل غمچھان تے غیرم مہ دیشو کندوری لاڑیس یارے

ترجمہ: ''اے محبوب حقیقی! میری نظریں تیرے در پر لگی ہوئی ہیں مگر تیری نظریں رقیب پر جا کر ٹھہرتی ہیں! میں تیری نظروں کے قربان جاؤں! آخر کب تک رقیب پر ہی تیرا نظر کرم رہے گا! اور کب میری

آزمائشوں کا دور ختم ہوگا!''

عمر عزیز کا رونا شعرا نے بہت رویا ہے۔ یہاں تک کہ اس میں جدت کے تمام پہلو ختم ہو گئے اور شعرا نے خود کو دہرانا شروع کیا۔ مرزا محمد سیئر کے یہاں محاکات کے پیرایے میں یہ مضمون ایک اچھوتے اسلوب میں ملتا ہے۔ آپ کہتے ہیں:

شورو دریا ہو غونہ موش مہ عمر کم ہیچاؤ گویان
ڈاقیو عمر بغائے زاروئیو غم ہیچاؤ گویان

ترجمہ: ''لوگو! میری عمر خزاں کے دریا کی طرح گھٹتی جا رہی ہے، جوانی کا زمانہ گزر گیا اب صرف بڑھاپے کا غم ہے اور میں ہوں۔'' عمر کے گھٹنے کو خزاں کے دریا سے تشبیہ دے کر مرزا محمد سیئر نے ایک نیا زاویہ فکر ڈھونڈ لیا ہے دنیا کی بے ثباتی، فکر آخرت اور محبوب حقیقی کے وصل کی نزدیکی کا مضمون گھٹتے دریا کے ساتھ تشبیہ پانے کے بعد موثر طور پر سامنے آیا ہے اور دریا کی روانی کی طرح متحرک نظر آتا ہے۔ یہی مضمون آپ نے ''یارِ من ہمیں'' کے ایک شعر میں برف پرندے اور گھوڑے کے استعاروں کی مدد سے باندھا ہے، کہتے ہیں ''اے کالے رنگ کے چغالی نامی پرندے! تو آواز نہ نکال میں ایک برف پوش وادی میں پہنچ گیا ہوں، سفید گھوڑے پر سوار ہوں اور پابہ رکاب ہوں۔

چغالی چاغ موکورے یا رخو نو دار بانہ آسوم
سورخون استور مہ موڑا پونگ لکھی اڑ غانہ اسوم یارے

یہاں چغالی کا سیاہ رنگ جوانی کا استعارہ، یار خون کا دار بن برف، سفیدی اور بڑھاپے کا استعارہ ہے یہ سرحد پار کرنے کے عزم کا استعارہ بھی ہے۔ سفید گھوڑا پھر بڑھاپے کا رنگ ہے۔ اور پابہ رکاب ہونا، داعی اجل کے انتظار میں ہونے کا کنایہ ہے۔ اسی مضمون کا شعر مولانا الطاف حسین حالی کے ہاں ان الفاظ میں ملتا ہے۔

وقتِ پیری اور شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

راہ سلوک میں مجاز سے حقیقت کی طرف سفر بھی صوفیا کا پسندیدہ مضمون ہے۔ حکیم عمر خیام کی طرح مرزا محمد سیر کے کلام کی بھی کئی جہتیں ہیں۔ اس کا سرسری مطالعہ کرنے والا سمجھتا ہے کہ شاعر عشق مجاز کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا ہے۔ مگر حقیقت یہ نہیں۔ آپ کے ہاں عشق حقیقی کا رنگ نمایاں ہے مجاز سے حقیقت کی طرف اپنے سفر کو ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے۔

کورین کوری بغائے مرزا مہسیارو لوڑوریا
ساگہت دیتی شیر ٹھونہ مہ ستھارو لوڑور

ترجمہ: ''لوگو! مرزا مہسیار کہاں سے کہاں پہنچ گیا، دیکھو تو سہی میرا ''سہ تار'' (آلہ موسیقی) کب سے بے سراپڑا ہے۔ زمانہ بیت گیا اس پر کوئی راگ ہی نہیں چھیڑی۔'' سہ تار چترال میں مشہور آلہ موسیقی ہے اسے عشق مجاز کے لئے استعارہ بنایا گیا ہے اسی طرح راہ سلوک میں اپنے سفر کا حال بیاں کرتے ہوئے خود بھی کئی بار آبدیدہ ہوئے ہونگے دوسروں کو بار بار آبدیدہ کر دیتے ہیں۔ یار مین ہمیں کا ایک شعر ان کے حال اور واردات قلب کا عکس ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

زومو سورین بغاتم پیچ قونو سورین بغاتم یارے
زروخ زروخ کیڑاؤ بغاتم اشروان مژاؤ بغاتم یارے

ترجمہ: ''میرے محبوب! راہ سلوک میں مجھ پر کیا بیتی! کبھی پہاڑوں کو پھلانگتے ہوئے گذرا، کبھی تپتے انگاروں پر میں نے پاؤں رکھے، کبھی زاروقطار روتے ہوئے سفر کیا۔ اور کبھی میں نے آنسو پو چھتے ہوئے راہ کاٹی۔'' ''زومو سورین'' کھوار میں ذومعنی لفظ ہے یہ ایک پہاڑ کا نام بھی ہے اور اس کے لفظی معنی پہاڑ کو پھلانگنے کے بھی ہیں۔ اس شعر میں شاعر نے سالک کو پیش آنے والے مصائب کا ذکر قبض وبسط کے پردے میں کیا ہے۔ لف ونشر غیر مرتب کی صنعت میں پہلے مصرعے کے اندر ''بسط'' کی کیفیت پہلے اور قبض کی کیفیت

بعد میں آتی ہے۔ دوسرے مصرعے میں قبض کی کیفیت پہلے ہے بسط کی کیفیت بعد میں آتی ہے۔ یہ وہی کیفیت ہے جس کی طرف شیخ سعدی شیرازی نے یوں اشارہ کیا ہے:

گہ برطارم اعلیٰ نشینم
گہ بر پُشتِ پائے خود نہ بینم

محاکات کے پردے میں تصوف کے رازوں کا افشا مرزا محمد سیر کا خاص انداز ہے گویا یہ ان کا ادائے خاص ہے۔ دنیا کی لذات اور راہ سلوک کی مشکلات کو بیان کرتے ہوئے نفس امارہ کو خبردار کرنے کے لئے انہوں نے نیا اسلوب اختیار کیا ہے۔ ''یار من ہمیں'' کا ایک شعر ہے۔

کورا کوروبرون شیوونیان کورا زومو ریژباریکی یارے
کورا کوو درے مہ ماریس مہ لوا نوباک شاریکی یارے

ترجمہ: '' (راہ سلوک کا یہ حال ہے کہ) کہیں لالہ زار اور مرغزار لہلہاتے ہوئے دعوت نظارہ دیتے ہیں۔ کہیں پہاڑی پگڈنڈیوں میں پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں ملتی اے میرے محبوب! تم کسی دن مجھے کسی کھائی میں گرا کر تباہ وبرباد کروگے۔'' اس شعر میں جو محاکات ہیں ان میں سے لہلہاتے لالہ زار اور مرغزاروں سے مراد دنیوی لذات ہیں۔ جو سالک کو اپنی طرف کھینچتے اور راہ حق سے غافل کرتے ہیں۔ پہاڑی پگڈنڈیوں سے مراد شریعت کا راستہ ہے۔ جہاں پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ تھوڑی سی غفلت سے قدم ڈگمگانے کا اندیشہ ہوتا ہے یہاں محبوب سے مراد نفس امارہ ہے جو دنیوی لذات کی طرف کھینچتا ہے اور سالک کو کسی گہری کھائی میں گرا کر اس کی منزل کھوٹی کر دیتا ہے۔

''یار من ہمیں'' کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی کام کی ضرورت ہے کم وبیش 200 سال پہلے یہ گیت جس زبان میں تخلیق ہوا۔ وہ زبان کھوار ہے جو اردو کے ماخذات میں سے ایک ہے۔ شمالی ہند کے پہاڑی علاقوں میں بولی جانے والی یہ زبان جنوبی ہند کی قدیم دکنی بولیوں سے قربت ومناسبت رکھتی ہے اس حوالے سے ''یار من ہمیں'' کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے، عالمی ادب میں اسکے مقام کی وجہ سے بھی اور ہند آریائی

زبانوں کے مطالعے میں اسکی وقعت کی وجہ سے بھی۔ عہد حاضر میں اردو کے ممتاز سفرنامہ نگار مستنصر حسین تارڑ چترال سے گذر رہے تھے گاؤں ریشن سے آگے شوگرام کے مقام پر انہیں مرزا محمد سیئر کا مزار دکھایا گیا۔ یارمن ہمیں کے چند اشعار کا ترجمہ سنایا گیا۔ انھوں نے اپنے سفرنامے میں لکھا مرزا محمد سیئر لاہور میں پیدا ہوکر وہیں دفن ہوتا تو بہت بڑا ولی کہلاتا ایک گمنام پہاڑی وادی میں پیدا ہوکر یہیں دفن ہونے کی وجہ سے اس کا نام بھی کسی کو معلوم نہیں ہے۔ (۴)

عالمی ادب اور کلاسیک کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس پر وقت کی گرد نہیں بیٹھتی۔ نیز مقام، علاقہ اور ملک کی تبدیلی سے اس کے معانی اور مفاہیم اپنی اہمیت کو کم نہیں کرتے۔ ''یارمن ہمیں'' کلاسیک کی ان خصوصیات پر بخوبی پورا اترتا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ غفران محمد مرزا: نئی تاریخ چترال پبلک آرٹ پریس پشاور 1962 ص 12-411

2.Fateh Muhammad Malik Prof.: Unity and Variety in Sufi Poetic Tradition, the lagacy of Baba Siyar, Diynamics of change, editor Stellrecht, Germany 1988: PP 641-52.

3۔ غلام عمر: باباسیر، لوک ورثہ اسلام اباد 1982 ص 59-83

4۔ مستنصر حسین تارڑ: چترال داستان، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور 2002، ص 27-126

کتابیات

۱۔ اسرار الدین: کھوار زبان و ادب، تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند (ایڈیٹر سید فیاض محمود) پنجاب یونیورسٹی لاہور 1963ء۔

۲۔ فتح محمد ملک: یونیٹی اینڈ ورائٹی ان صوفی پوئٹک ٹریڈیشن، بابا سیر کا ورثہ، ڈاینامکس آف چینج، ایڈیٹر سٹل ریحت کیڈیگر کوپ ورلاگ، تیان چن جرمنی 1988ء۔

۳۔ غلام عمر: باباسیر، لوک ورثہ اسلام آباد۔ 1982ء

۴۔ عرفان محمد: انتخاب شعرائے چترال (غیر مطبوعہ) 2004ء۔

۵۔ غفران محمد مرزا نئی تاریخ چترال، پبلک آرٹ پریس پشاور 1962ء۔

۶۔ مستنصر حسین تارڑ: چترال داستان سنگ میل پبلیکیشن لاہور 2002ء۔